نقطۂ نظر:

حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کی قبور اور مولانا تقی عثمانی
ایک تنقیدی جائزہ

ڈاکٹر سید رضوان علی ندوی (☆)

ہر خاص و عام جانتا ہے کہ سیدنا علی کرم اللہ وجہہ کی قبر مبارک عراق کے شہر نجف اشرف میں ہے۔ لیکن میری نظر سے حال ہی میں جسٹس ریٹائرڈ مولانا محمد تقی عثمانی صاحب کے سفرنامے، "جہان دیدہ" کا تازہ ایڈیشن (۱۹۹۴ء) گذرا، یہ سفرنامہ پہلی بار ۱۴۱۰ھ (۱۹۸۹ء) میں چھپا تھا۔

عراق کے سفر کے ذکر میں مجھے یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ مولانا موصوف نے سیدنا علی کرم اللہ وجہہ کی قبر کے بارے میں شکوک و شبہات پیش کئے ہیں [۱] (ص ۷۳۔۷۴)۔ جب کہ دمشق میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی قبر کو تلاش کرنے میں کامیاب ہو گئے اور ایک ایسی قبر کو ان کی قبر قرار دیا جو تاریخی شواہد اور اہل ملک محققین کے بیان کے بموجب حضرت معاویہؓ کی قبر نہیں۔ اس کا ذکر ہم بعد میں کریں گے، پہلے سیدنا علیؓ کی قبر کے بارے میں مولانا کی تحقیق اور اس پر جائزہ پیش کرتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

"واقعہ یہ ہے کہ اس مقام پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کا مدفون ہونا تاریخی اعتبار سے خاصا مشکوک ہے" دلچسپ بات یہ ہے کہ اس کے فوراً بعد وہ لکھتے ہیں۔ "اگرچہ اب یہ بات تواتر

☆ سابق پروفیسر، شعبہ تاریخ و ثقافت، لیبیا یونیورسٹی۔

کے ساتھ مشہور ہو چکی ہے کہ حضرت علیؓ کا مزار یہی ہے" اور پھر دوبارہ وہ اپنے شک کو اس طرح دہراتے ہیں "لیکن حضرت علیؓ کے مقام تدفین کے بارے میں تاریخی روایات اس قدر مختلف اور متضاد ہیں کہ کوئی بات یقین کے ساتھ کہنا مشکل ہے"۔

اس کے بعد مولانا موصوف نے یہ "مختلف اور متضاد تاریخی روایات" تاریخ کی مختلف کتابوں سے نہیں بلکہ صرف ایک کتاب یعنی خطیب بغدادی (وفات ۴۶۳ھ) کی کتاب "تاریخ بغداد" سے پیش کی ہیں۔

مولانا محمد تقی عثمانی صاحب نے اپنے اس سفرنامہ میں صرف اپنے مشاہدات نہیں لکھے ہیں بلکہ بہت سے امور سے بحث کی ہے اور اس کے لئے عربی' اردو اور انگریزی کتابوں کے بیانات اور حوالے پیش کئے ہیں' اور اس طرح اپنے سفرنامے کو ایک تحقیقی کتاب بنانے کی کوشش کی ہے جو بہت مستحسن اور مفید ہے' اگرچہ سفرنامے کا مقصد یہ نہیں ہوتا۔ مزید برآں کہ انہوں نے خطیب بغدادی کی کتاب پر اکتفا کیا اور اسی بنیاد پر سیدنا علیؓ کی قبر کے بارے میں مشکوک ہونے کا فتوی صادر کر دیا' حالانکہ تحقیق کا تقاضا تھا کہ وہ ایک ایسے اہم معاملے میں دوسری قدیم و جدید کتابوں سے بھی رجوع کرتے اور پھر کوئی فیصلہ دیتے۔

راقم الحروف نے سیدنا علیؓ کی قبر مبارک سے متعلق جو تحقیق کی ہے وہ اور اس کا نتیجہ یہاں قارئین کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں' لیکن اس سے قبل میں وہ شکوک سامنے لانا چاہتا ہوں جو مولانا تقی عثمانی صاحب نے خطیب بغدادی کی کتاب "تاریخ بغداد" جلد اول سے پیش کئے ہیں اور پھر ان کا تنقیدی تجزیہ پیش کیا جائے گا۔

۱۔ احمد بن عبداللہ العجلی کہتے ہیں کہ حضرت علیؓ کو کوفہ میں دفن کیا گیا لیکن ان کی قبر کی جگہ معلوم نہیں۔

۲۔ ابن سعد کا کہنا ہے کہ حضرت علیؓ کو کوفہ میں جامع مسجد کے قریب قصر الامارہ میں دفن کیا گیا۔

۳۔ ابو زید بن طریف کہتے ہیں کہ جامع مسجد کی دیوار قبلہ کے ساتھ باب الوراقین کے سامنے ایک گھر ہے' حضرت علیؓ اس میں مدفون ہیں۔ یہ گھر یزید بن خالد نامی ایک صاحب کا تھا

اور ایک روایت یہ بھی ہے کہ کسی موقع پر اس گھر کو کھودنا پڑا تو اس میں سے حضرت علیؓ کی نعش تر و تازہ برآمد ہوئی۔

۴۔ بعض روایات میں آیا ہے کہ حضرت علیؓ دفن تو کوفہ میں کئے گئے تھے لیکن حضرت حسنؓ، حضرت معاویہؓ کے عہد میں آپ کی نعش مبارک کو مدینہ طیبہ لے گئے تھے اور وہاں حضرت فاطمہؓ کے مزار کے قریب جنت البقیع میں آپ کو دفن کیا گیا۔

۵۔ ایک اور روایت میں ہے کہ حضرت علیؓ کو شہادت کے فوراً بعد ہی ایک تابوت میں رکھ کر ایک اونٹ پر سوار کرا دیا گیا تاکہ انھیں مدینہ طیبہ لے جائیں، لیکن راستے میں قبیلہ طی کے علاقہ میں پہنچ کر وہ اونٹ گم ہو گیا۔ قبیلہ طی کے لوگوں نے اس صندوق کو خزانہ سمجھ کر اٹھا لیا، لیکن جب اندر نعش دیکھی تو اسے وہیں اپنے علاقہ میں دفن کر دیا۔

۶۔ ابو جعفر حضریؒ (صحیح حضرمی ہے) جو مطین کے لقب سے مشہور ہیں، فرماتے ہیں کہ آج (نجف میں) جس قبر کو لوگ حضرت علیؓ کا مزار سمجھ کر اس کی زیارت کرتے ہیں، اگر وہ واقعتاً حضرت علیؓ کا مزار نہیں ہے اور جن صاحب کا وہ مزار ہے اگر ان کا نام روافض کو معلوم ہو جائے تو وہ اس قبر کی زیارت کرنے کے بجائے اسے سنگسار کرنے کی کوشش کریں۔ یہ صاحب مزار دراصل حضرت مغیرہؓ ابن شعبہ ہیں۔

یہ وہ چھ روایات ہیں، جن کو مولانا تقی عثمانی صاحب نے پانچویں صدی ہجری کے ایک محدث اور اسماء رجال کے مصنف خطیب بغدادی سے نقل کرنے کے بعد اپنا فیصلہ یوں صادر کیا ہے۔

"ظاہر ہے کہ ان روایات کے پیش نظر حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے مزار کے بارے میں کوئی بھی بات یقین سے نہیں کہی جا سکتی"۔

عجیب بات ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا زاد بھائی۔ پروردہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم، فاتح خیبر اور چوتھے خلیفہ راشد کی قبر کا پتہ ہی نہیں کہ وہ کہاں ہے اور نجف میں جہاں صدیوں سے ان کی قبر مشہور و معروف ہے وہ بقول مولانا تقی عثمانی صاحب بحوالہ مطینؒ حضرت معاویہؓ کے مقرر کردہ گورنر کوفہ حضرت مغیرہؓ بن شعبہ کی ہے اور جن کی وفات حضرت علیؓ کی شہادت کے دس سال بعد میں ۵۰ ہجری میں ہوئی ۔ یہ وہی حضرت مغیرہؓ ہیں، جنہوں نے حضرت

معاویہؓ کو مشورہ دیا تھا کہ اپنے بیٹے یزید کو ولی عہد بنا کر اس کی بیعت لیں (یہاں ملحوظ خاطر رہے کہ حضرت حسن کی شہادت صحیح روایات یعنی امام بخاری کے استاذ محدث و مورخ خلیفہ بن خیاط اور عظیم مورخ امام ذہبی کے اقوال کے مطابق سن ۴۹ ھ میں ہوئی (۲) ۔ جبکہ حضرت مغیرہؓ کی وفات شعبان ۵۰ھ میں ہوئی)۔ اسی لئے معین نے یہ بات کہی کہ اگر شیعی حضرات کو معلوم ہو جائے تو وہ اس قبر کی تعظیم کے بجائے اس کو سنگسار کریں۔

اب ہم ان روایات کا ایک ایک کر کے تنقیدی تجزیہ کرتے ہیں تاکہ حقیقت حال معلوم ہو سکے اور "جہاں دیدہ" کے سبب جو شبہات پیدا ہو گئے ہیں ان کا ازالہ کیا جا سکے۔

ان چھ متضاد روایات پر گفتگو سے قبل یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ خود خطیب بغدادی کا رجحان معلوم کیا جائے۔ سب سے پہلے یہ بات کہ کوئی شک نہیں کہ وہ ایک عظیم محدث' ناقد اور اسماء رجال کے ماہر اور ان موضوعات پر ایک مایہ ناز مصنف اور محقق ہیں' لیکن وہ متعارف معنی میں امام طبری اور ابن الاثیر وغیرہ کی طرح مورخ نہیں اور پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ جغرافیہ ان کا موضوع نہیں۔ تاریخی رجحان نہ رکھنے کے علاوہ خطیب بغدادی پر ناصبیت کا الزام بھی ہے جس کا ذکر ذہبی نے ابن عساکر کی تاریخ دمشق کے حوالے سے کیا ہے۔

پھر یہ کہ کیا مولانا تقی عثمانی صاحب' خطیب بغدادی کی ان روایات کو تسلیم کرتے ہیں جو انہوں نے امام ابو حنیفہ کی قدح میں اپنی اسی تاریخ بغداد کی تیرہویں جلد میں پیش کی ہیں' جو ہم مشہور و منصف شافعی مورخ ابن خلکان کے اتباع میں پیش نہیں کرتے' جنہوں نے ان روایات کے نقل کرنے سے ان الفاظ میں احتراز کیا ہے " ومناقبه و فضائله كثيره ۔ وقد ذكر الخطيب في تاريخه منها شيئا كثيرا' ثم اعقب ذلك بذكر ما كان الأليق تركه والاحزاب عنه" (۴) (امام ابو حنیفہ کے مناقب و فضائل بہت زیادہ ہیں۔ خطیب نے اپنی تاریخ میں ان میں سے بہت سے فضائل کا ذکر کیا ہے' اور اس کے بعد امام صاحب کے خلاف ایسی باتوں کا ذکر کیا ہے' جن کا ترک کرنا اور ان سے چشم پوشی زیادہ مناسب تھا)۔

ہم یہاں مزید کہیں گے کہ خطیب کا یہ ناروا عمل محض مذہبی (شافعی) تعصب کی وجہ سے نہیں تھا بلکہ اس وجہ سے بھی تھا کہ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ علیہ اہل بیت سے انتہائی محبت رکھتے تھے' انہوں نے محمد الباقرؒ اور جعفر الصادق سے تلمذ کیا تھا اور بنی امیہ کے خلیفہ ہشام بن

عبدالملک کے خلاف مسلح تحریک میں مالی اور اخلاقی طور پر حضرت زید بن علی زین العابدین ؒ کا ساتھ دیا تھا۔ اور ابو جعفر منصور کے خلاف محمد النفس الزکیہ (سیدنا حسن ؓ سبط کے پڑپوتے) اور ان کے بھائی ابراہیم کا ساتھ دیا تھا' اور درحقیقت اسی وجہ سے امام موصوف کو ان دونوں خاندانوں کے حکمرانوں نے کوڑوں کی سزا دی تھی اور اسی محبت اہل بیت کی بناء پر خطیب بغدادی نے شافعی تعصب کے ساتھ اپنے ناصبی رجحان کے تحت امام صاحب ؒ کو مطعون کیا۔

حقیقت یہ ہے کہ خطیب بغدادی امام ابو حنیفہ کے ان متعصب اور کور چشم دشمنوں کی زبان تھے' جنہوں نے امام اعظم کو بدنام اور بے اعتبار ٹھہرانے کی مہم چلائی اور ان سے ملحدانہ عقائد تک منسوب کر دیئے۔ اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے عصر حاضر کے عظیم حنفی مصری عالم زاہد الکوثری مرحوم کو' جنہوں نے خطیب بغدادی کے امام اعظم ؒ کے خلاف ان اتہامات کی تردید میں اپنی کتاب "تأنیب الخطیب" تصنیف کی۔

ہمیں پورا یقین ہے کہ مولانا تقی عثمانی صاحب خطیب بغدادی کے امام ابو حنیفہ ؒ کے خلاف اتہامات اور غلط بیانیوں سے واقف ہیں' اور ان کو تسلیم نہیں کرتے ہیں' پھر انہوں نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی قبر مبارک سے متعلق خطیب بغدادی کی پیش کردہ روایات کو کیوں تسلیم کر لیا؟

خطیب بغدادی کی مزعومہ روایات کا تنقیدی جائزہ۔

۱۔ پہلی روایت احمد بن عبداللہ العجلی کی ہے' جو فرماتے ہیں کہ حضرت علی ؓ کو کوفے میں دفن کئے گئے لیکن ان کی قبر کی جگہ معلوم نہیں۔ سوال یہ ہے کہ یہ احمد بن عبداللہ العجلی کون ہیں؟ اور کب تھے؟ اور ان کے کیا افکار ہیں؟

اگر مولانا تقی عثمانی صاحب زحمت فرماتے تو اسی کتاب سیر اعلام النبلاء' ذہبی میں جس کا حوالہ انہوں نے اپنے سفرنامے میں اکثر دیا ہے' ان کے حالات معلوم ہو جاتے۔ یہی وہ صاحب ہیں جو المامون کے زمانے میں "مشہور مسئلہ" "خلق قرآن" کے وقت کوفے سے شمالی افریقہ کے شہر طرابلس کو بھاگ گئے تھے' اور تاریخ کے طالب علم جانتے ہیں کہ اس زمانے میں موجودہ لیبیا کا یہ شہر خارجیوں کا مرکز تھا۔ اگرچہ امام ذہبی نے یہ نہیں لکھا ہے۔

اور پھر امام ذہبی کے بقول یہی وہ صاحب ہیں جن کا کہنا ہے کہ "جو یہ کہتا ہے کہ قرآن

مخلوق ہے وہ کافر ہے" لیکن عباسی خلفاء المامون المعتصم' الواثق' سب کافر ٹھہرے اور وہ تمام علماء شام و عراق و مصر وغیرہ بھی جنہوں نے ریاستی جبر کے تحت قرآن کو مخلوق مان لیا تھا اور اس میں امام احمد بن حنبل اور ان کے دو ایک ہم نواوں کے علاوہ تمام محدثین و فقہاء شامل تھے۔ خود امام احمدؒ نے ان میں سے کسی کو کافر نہیں گردانا۔

مگر ہمارے موضوع سے متعلق بات یہ ہے کہ انہوں نے تاریخ پر کوئی کتاب نہیں لکھی ہے نہ ان کا شمار مورخین میں ہے' ذہبی نے ان کی نقد رجال حدیث یعنی الجرح والتعدیل پر صرف ایک کتاب کا ذکر کیا ہے' اور پھر سب سے اہم قابل ذکر بات یہ ہے کہ ان کی وفات بقول ذہبی سن ۲۶۱ھ میں ہوئی (۵) ' جبکہ ان سے قبل کے ایک مصنف جو بغداد کے رہنے والے تھے یعنی ابن سعد (وفات ۲۳۰ھ) صحابہ کرام اور تابعین پر اپنی مشہور اور مستند کتاب الطبقات الکبری میں پوری تفصیل اور دقت کے ساتھ حضرت علیؓ کی کوفہ میں قبر کی جگہ متعین کرتے ہیں' جس کا ذکر ابھی آگے آتا ہے۔

اس طرح احمد العجلی کی روایت جو ابن سعد کی کتاب کے تقریباً چالیس پچاس سال بعد کی ہے' ناقابل اعتناء ہے' کیونکہ انہوں نے کوئی سلسلہ سند پیش نہیں کیا ہے' جبکہ ابن سعد نے متعدد ثقہ اسناد سے روایت کی ہے۔

۲۔ خطیب بغدادی کی دوسری روایت انہی ابن سعد سے منقول ہے' جس میں قطع و برید سے کام لیا گیا ہے' ابن سعد نے یہ نہیں کہا ہے کہ "حضرت علیؓ کو کوفے میں جامع مسجد کے قریب قصرالامارہ میں دفن کیا گیا" جیسا کہ خطیب نے ذکر کیا ہے' بلکہ ان کے الفاظ یہ ہیں۔

"و دفن علی بالکوفه عند مسجد الجماعه فی الرحبه محایلی ابواب کندة" (۶)

یعنی علیؓ کوفے میں جامع مسجد کے پاس اس وسیع میدان میں دفن کئے گئے جو قبیلہ کندہ کے دروازوں سے قریب ہے۔

آپ نے دیکھا کہ خطیب بغدادی نے محض اپنی یادداشت پر بھروسہ کرتے ہوئے حضرت علیؓ کی قبر کے بارے میں کیسی غلط بات لکھی ہے۔ یہاں یہ بھی عرض کر دوں کہ ان کے حافظے کے بارے میں ذہبی نے بعض قدیم محدثین کی رائے نقل کی ہے کہ وہ اچھا نہ تھا' "اگر ان سے کوئی بات پوچھی جاتی تو وہ کئی دن کے بعد بتاتے' اور اگر اصرار اور تقاضا کیا جاتا تو بہت غصے

ہوتے اور سخت برہم ہو جاتے تھے' ان کا حافظہ ان کی تصانیف جیسا نہیں تھا۔ (۷)

حضرت علیؓ کی قبر کے بارے میں ابن سعد کا یہ بیان اس قدر دقیق ہے کہ اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں' وہ نہ تو قصرالامارہ (گورنر ہاؤس) میں دفن ہوئے اور نہ کوفے کی مسجد میں' بلکہ قبیلہ کندہ کے محلے کے دروازوں کے پاس اس وسیع میدان میں دفن ہوئے جو جامع مسجد کے قرب و جوار میں واقع تھا۔ رحبہ اس وسیع میدان کو کہتے ہیں جو کسی شاہی محل یا جامع مسجد کے دروازے سے قبل دور تک پھیلا ہوتا ہے اور مشہور قدیم عرب ماہر لغت ابن الاعرابی کے بیان کے مطابق رحبہ ایک وسیع و عریض زمین کو بھی کہتے ہیں' یاقوت نے اپنی جغرافیائی عظیم ڈکشنری "معجم البلدان" میں "رحبہ" کے تحت یہ تعریف نقل کی ہے اور بہت سے ان مقامات کا ذکر کیا ہے جو رحبہ کے نام سے مشہور تھے' انہی میں سے کوفہ میں ایک رحبہ قاضی ابو یوسف کے پردادا خفیس کے نام سے مشہور تھا۔

۳۔ خطیب بغدادی کی تیسری روایت انتہائی مہمل اور ناقص ہے' جو ابن سعد کی مذکورہ قدیم روایت سے متناقض بھی ہے۔ ابو زید بن طریف کہتے ہیں کہ حضرت علیؓ کوفہ میں باب الوراقین کے سامنے ایک گھر میں مدفون ہیں جو یزید بن خالد کا تھا' اور جب اس گھر کو کھودا گیا تو اس میں سے حضرت علی کی نعش تروتازہ برآمد ہوئی۔ سبحان اللہ کیا روایت ہے! اتنا تو بتا دیا کہ تروتازہ میت برآمد ہوئی' مگر پھر اس میت کو کیا کیا گیا' کوئی ذکر ہی نہیں۔

حیرت کی بات ہے کہ جسٹس ریٹائرڈ مولانا تقی عثمانی صاحب نے اس روایت کو بعینہ نقل کر دیا اور نہ اس پر کسی استعجاب کا اظہار کیا اور نہ ہی اس کے داخلی تہافت کو دیکھا۔ وراقین (کتب فروش) کے نام سے محلے بغداد اور کوفے وغیرہ میں عباسی دور میں تیسری صدی ہجری میں قائم ہوئے' جب دوسری صدی ہجری کے اواخر اور تیسری صدی ہجری کی ابتداء میں خراسان و بغداد میں کاغذی صنعت کے قیام کے بعد کثرت سے کتابیں لکھی جانے لگیں اور ان قلمی کتابوں کی دکانیں قائم ہونے لگیں۔ حضرت علیؓ انہی ایک دادا کی اولاد ہاشم سے ہیں جو عباسیوں کے بھی جد امجد ہیں' عباسیوں کی حکومت کے قیام کے بعد انہوں نے بنی امیہ سے حضرت علیؓ' حضرت حسینؓ اور دیگر شہدائے اہل بیت کا سخت انتقام لیا تھا۔ دمشق میں اموی حکمرانوں کی قبریں تک کھدوا کر پھینک دیں۔ سو وہ یہ کس طرح گوارا کرتے کہ انہی کے خاندان بنی ہاشم کے ایک عظیم

فرزند حضورؐ کے پروردہ سگے چچا زاد بھائی اور چوتھے خلیفہ راشد کی قبر کو وہ ایک عام آدمی کے گھر میں رہنے دیں' اور پھر اس گھر کو کسی موقع پر کھودا جائے اور اس میں حضرت علیؓ کی نعش برآمد ہو تو عباسی خلفاء اس کا کوئی نوٹس ہی نہ لیں' اور پتہ ہی نہ چلے کہ پھر ان کی اس تروتازہ نعش کے ساتھ کیا کیا گیا۔

۴۔ چوتھی روایت کے راوی کے نام تک کا پتہ نہیں کہ یہ کس کی طبع زاد ہے' مگر یہ پہلی دو روایتوں کی طرح لغو ہے' اگر اس دور اول یعنی حضرت معاویہؓ کے عہد خلافت میں حضرت علیؓ کی نعش کو قبر سے کھود کر حضرت حسنؓ مدینہ منورہ لے جاتے تو یہ مورخ اس کا ذکر کرتا' اور یہ بات حضرت علیؓ کے متعقدین سے چھپی نہیں رہتی' اور نہ اولاد و احفاد علیؓ جو اس وقت' اور بعد کو برسوں مدینہ میں کثرت سے آباد تھے' بے خبر رہتے۔

اور پھر یہ کہ اس عہد اولین میں بلکہ کافی بعد تک اس کا رواج نہ تھا کہ کوئی شخص خواہ وہ کتنا ہی بڑا ہو اس کی نعش ایک شہر سے دوسرے شہر منتقل کی جائے۔ اگر ایسا ہوتا تو بغداد کے عظیم ترین خلیفہ ہارون الرشید کی نعش طوس میں واقع اس کی قبر میں نہ رہتی بلکہ بغداد لائی جاتی' اور المامون کی نعش موجودہ ترکی کے شہر طرطوس میں نہ رہتی' وہ بھی بغداد لائی جاتی۔ لہٰذا یہ بھی ایک گمنام اور بے سروپا روایت ہے۔

۵۔ یہ پانچویں گمنام روایت کہ حضرت علیؓ کی نعش کو ان کی شہادت کے فوراً بعد ایک تابوت میں رکھ کر مدینہ طیبہ لے جانے کے لئے ایک اونٹ پر سوار کر کے اس کو ہانک دیا گیا' اور راستے میں قبیلہ طی کے علاقہ میں وہ اونٹ کھو گیا قبیلہ طی کے ہاتھوں جب یہ تابوت لگا تو انہوں نے اس کو خزانہ سمجھ کر کھولا' اور جب اس میں سے حضرت علیؓ کی نعش نکلی تو اس کو وہیں دفن کر دیا' کہاں؟ یہ معلوم نہیں۔ یہ ایک ایسی انتہائی بے سروپا اور لغو روایت ہے کہ حافظ ابن کثیر تک نے اپنی تاریخ البدایہ والنہایہ (۸) میں اس کو بے سروپا اور ایسی بات کہا ہے جس کو نہ تو عقل تسلیم کرتی ہے اور نہ شرعی طور پر یہ قابل قبول ہے۔ خیال تو کیجئے کہ ایک خلیفہ راشد کو شہید کیا جائے' اس کا فرزند سید نا حسنؓ اس کے بعد کوفے میں خلیفہ تسلیم کیا جائے جس کے پاس چالیس ہزار کی فوج ہو اور وہ چھ ماہ تک وہاں خلیفہ اسلام رہے' اور اس کے والد اور چوتھے خلیفہ راشد کی لاش کو ایک تابوت میں رکھ کر اونٹ پر کس کر یونہی ہانک دیا جائے' اس کے ساتھ کوئی

فوجی دستہ تک نہ ہو۔ اور پھر اس دستے کو اونٹ کے گم ہو جانے کی خبر تک نہ ہو اور کسی گمنام جگہ پر قبیلہ طی کے صحراء میں وہ دفن کر دیئے جائیں۔ اس روایت کو عقل سلیم تسلیم کرنے سے عاجز ہے۔

۶۔ چھٹی اور آخری روایت ایک صاحب مطینؒ کی ہے' اور یہ ایک عجیب ترین روایت ہے جس کی تحلیل و تجزیہ کیا جائے تو یہ بھی مہمل و لغو ٹھہرے گی' اس روایت کے راوی ابو جعفر محمد بن عبداللہ الحضرمی الملقب مطین بھی ایک محدث تھے۔ یہ تیسری صدی ہجری کے آدمی ہیں' سن ۲۹۷ھ میں ان کی وفات ہوئی۔ نہ معلوم انہوں نے یہ انکشاف کب کیا کہ کوفے میں جو قبر سیدنا علیؓ کی مشہور ہے' وہ دراصل حضرت مغیرہؓ بن شعبہ کی ہے جو کوفہ میں حضرت معاویہؓ کے گورنر تھے' اور حضرت علیؓ کے دس سال بعد ان کا انتقال ہوا۔

ان کی وفات سے ۷۰ ۔ ۸۰ سال قبل ابن سعد نے اپنی طبقات الکبری میں صراحت کی ہے کہ حضرت علیؓ کوفہ میں دفن کئے گئے جن کے الفاظ اس بارے میں ہم اوپر نقل کر چکے ہیں۔ مزید توضیح اس سے ہوتی ہے کہ ابن سعد قبر کی جگہ کی تفصیلی نشاندہی کے ساتھ یہ بھی بتاتے ہیں کہ "حضرت علیؓ کو صلوہ الفجر کے فوراً بعد دفن کیا گیا اور حضرت حسنؓ نے ان کو دفن کیا' اس کے بعد لوگوں نے ان کے ہاتھ پر بیعت خلافت کی" (۱۰)

اب ابن سعد کے اس بیان کے بعد جو ان جناب مطین سے ۶۷ سال قبل فوت ہو چکے تھے' ان کی اس روایت کی کیا قیمت رہ جاتی ہے۔ اور پھر سب سے بڑی بات یہ کہ ابن سعد اپنی اس دقیق و مفصل روایت کو مشہور و ثقہ محدث و فقیہ و کیع بن الجراح کے واسطے سے ایک کوفی صحابی (۱۱) کلیب ابن شہاب الجرمی یا تابعی (۱۱ الف) سے روایت کرتے ہیں اور یہ محدث ابو داؤد کے بقول کوفہ کے بزرگ ترین لوگوں میں سے تھے' یہی نہیں ابن سعد یہ روایت دو اور سندوں سے مشہور تابعی شعبی سے بھی روایت کرتے ہیں' جن کی پیدائش' پرورش اور وفات کوفہ کی ہے اور وہ حضرت علیؓ کی شہادت کے وقت ۲۲ سال کے تھے' اور یقیناً ان کے جنازہ میں شریک ہوئے' کیونکہ وہ کہتے ہیں کہ سیدنا حسنؓ نے حضرت علیؓ کی نماز جنازہ پڑھائی اور چار تکبریں کہیں' اس کے بعد انہی شعبی اور کلیب نے حضرت علیؓ کی تدفین اور قبر کی جگہ کے بارے میں وہ دقیق بیان دیا ہے جس کو ہم اوپر نقل کر چکے ہیں۔ یہی نہیں ابن سعد نے یہ بیان امام بخاری

کے استاذ ابو نعیم فضل بن رکین سے بھی سنا جنہوں نے پوری سند کے ساتھ اس کو شعبی سے روایت کیا ہے۔

اب اس سب کے بعد جناب مطین کے اس بیان کی کیا قیمت رہ جاتی ہے جو انہوں نے بغیر کسی سند کے ڈھائی تین سو سال بعد دیا ہے کہ جس قبر میں حضرت علیؓ مدفون ہیں اس میں ان کا جسد خاکی نہیں بلکہ مغیرہ بن شعبہؓ ہیں۔

یہ ہے خطیب بغدادی کی ان چھ روایات کی حقیقت جن کا عقلی و نقلی بنیادوں پر ہم نے تفصیلی تجزیہ پیش کر دیا ہے۔ ان میں صرف ابن سعد کی قدیم اور مستند روایت ہی صحیح ہے' لیکن افسوس کہ وہ بھی ناقص پیش کی گئی اور ہم نے اس عظیم اور ثقہ مصنف کی کتاب الطبقات الکبری سے رجوع کر کے روایت کو انہی کے الفاظ میں لکھ دیا ہے۔

کوفہ۔ ظہرالکوفہ۔ نجف

ان روایات سے قطع نظر جن کی ہم تردید کر چکے ہیں' ایک اور سبب سے حضرت علیؓ کی جائے تدفین کے بارے میں شک پیدا ہوتا ہے کہ قدیم عربی ماخذ میں کہیں ان کی جائے تدفین کوفہ ہے اور کہیں ظہرالکوفہ اور آج کل یا چند صدیوں سے اس کو نجف کہا جاتا ہے۔

یہ شک درحقیقت کوفہ کی قدیم و جدید جغرافیائی حیثیت سے ناواقفیت کی وجہ سے ہے' اگر ابتداء سے اب تک کوفہ کے قیام اور جغرافیہ پر گہری نظر ڈالی جائے تو واضح ہوگا کہ یہ تینوں نام ایک ہی تصویر کے مختلف رخ ہیں۔

یہ شہر حضرت عمرؓ کے حکم سے سن ۱۷ ہجری میں ایک فوجی چھاؤنی کی حیثیت سے حضرت سعد بن ابی وقاص نے آباد کیا' اس کے قریب ہی قدیم عربی شہر "حیرہ" تھا۔ خلافت راشدہ کا یہ وہ عہد ہے جب سادگی پسندی حکومت کا شعار تھی' قدیم مورخ البلاذری نے اپنی کتاب "فتوح البلدان" میں کوفہ کے قیام اور اموی و اولین عہد عباسی میں اس کی ترقی و عمارات کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ وہ کوفہ جو حضرت عمرؓ کے عہد میں بسایا گیا تھا' بغداد کی تعمیر سے قبل عراق کا سب سے اہم اور صدر مقام ہو گیا تھا۔ بلاذری کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اموی دور میں مغیرہؓ بن شعبہ اور زیاد نے کوفہ کے دارالامارہ اور جامع مسجد میں کافی توسیع کی اور آخری عہد اموی میں کوفہ کے گورنر یزید بن عمر بن ہبیرہ نے کوفہ میں ہی فرات کے کنارے ایک دوسرا شہر آباد کیا' جو

مکمل نہیں ہو سکا کیونکہ آخری اموی خلیفہ مروان بن محمد نے حکم دیا کہ کوفہ چونکہ بنی ہاشم کے وفاداروں کا شہر ہے' اس لئے یہ نیا شہر اس میں تعمیر نہیں کیا جائے' اس لئے ابن ہبیرہ نے جاری تعمیر روک کر اپنے لئے قصر ہبیرہ کے نام سے ایک شہر کوفہ کے شمال میں تعمیر کیا' جس طرح حجاج بن یوسف نے کوفہ کو چھوڑ کر اس کے اور بصرہ کے درمیان واسط نام کا شہر بسایا تھا۔

سن ۱۳۲ ہجری میں عباسی حکومت کے قیام کے ساتھ اس کے پہلے خلیفہ ابوالعباس السفاح نے ابن ہبیرہ کے کوفے میں نئے تعمیر کردہ شہر کو اپنا مستقر بنایا' اور اس کی نامکمل تعمیرات کی تکمیل کی اور کچھ نئی عمارات بنائیں (۱۲) ۔ لیکن چونکہ لوگ اس کو مدینہ ابن ہبیرہ (شہر ابن ہبیرہ) کے نام سے ہی یاد کرتے رہے جو اموی عہد کی یاد دلاتا تھا اس لئے السفاح نے اس کے مقابل ایک دوسرا شہر ہاشمیہ کے نام سے آباد کیا' لیکن وہ وہاں بھی زیادہ عرصے نہیں رہا اور اس سے قدرے دور اس نے پرانے عراقی شہر "انبار" سے ملحق ایک نیا شہر ہاشمیہ کے نام سے بسایا' جہاں وہ منتقل ہوا اور وہیں اس کی وفات ہوئی۔

سن ۱۳۶ ہجری میں جب ابو جعفر المنصور خلیفہ بنا تو اس نے دوبارہ ہاشمیہ کوفہ کو ہی اپنا پایہ تخت بنایا اور اس میں مزید نئی تعمیرات کیں حتی کہ سن ۱۴۹ ہجری میں بغداد کی تعمیر کے بعد وہ وہاں منتقل ہو گیا۔

ہم نے یہ تفصیلات اس لئے یہاں پیش کی ہیں کہ معلوم ہو سکے کہ جس کوفہ کا ذکر بعد کے مورخین کرتے ہیں اموی اور اولین عباسی دور میں وہ کوفہ نہیں تھا جس میں حضرت علیؓ کی شہادت و تدفین ہوئی تھی وہ "ظاہر الکوفہ" یا "ظہر الکوفہ" (بیرون کوفہ) جہاں سے بلاذری کے مفصل و دقیق بیانات کے مطابق (۱۳) حضرت سعدؓ بن ابی وقاص نے کوفہ کی تعمیر شروع کی تھی بعد کے یہود میں کوفہ میں شامل ہو گیا' بالکل ہی ایسے جیسے بیرون موچی گیٹ۔ بیرون دلی دروازہ اور کراچی کے ان گوٹھوں کا معاملہ ہے جو اب لاہور' دہلی اور کراچی میں شامل ہو چکے ہیں۔ اس لئے کوفہ اور ظہر الکوفہ ایک ہی چیز ہیں۔

اصل اعتراض یا سوال تو یہ ہو سکتا ہے کہ پرانی تواریخ میں حضرت علیؓ کی تدفین کا مقام کوفہ ہے یہ نجف کہاں سے آ گیا' جہاں اب صدیوں سے حضرت علیؓ کا مزار قائم ہے؟

اس سوال کا جواب بھی ہمیں ادب اور جغرافیہ کی قدیم عربی کتابوں کے تتبع سے مل جاتا

ہے۔ کوئی شک نہیں کہ قدیم ترین موجود و متداول کتاب طبقات ابن سعد اور دوسری قدیم تواریخ میں یہی ہے کہ وہ کوفہ میں دفن کئے گئے اور اس میں نجف کا ذکر نہیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ نجف نامی کسی علاقے کا وجود ہی اس وقت نہیں تھا۔ لیکن حضرت علیؑ کے مزار کے حوالے سے یہ کس طرح مشہور ہوا اس پر ہم یہاں روشنی ڈالیں گے۔

ہم ابھی کچھ پہلے عرض کر چکے ہیں کہ کوفہ کی ابتدائی تعمیر ظہرالکوفہ کے پر فضا مقام سے شروع کی گئی جو مختلف قسم کے صحرائی پھولوں کی وجہ سے اس وقت "خدالعذراء" (عارض حسینہ) کے نام سے یاد کیا جاتا تھا (۱۴) ۔ یاقوت نے اپنی جغرافیائی ڈکشنری معجم البلدان میں اس کا ذکر کیا ہے اور اس کے ساتھ مغربی سمت میں وہ صحرا تھا جہاں مختلف قسم کا شکار مہیا تھا' نجف کا قدیم ترین ذکر ہم کو اولین عباسی دور کے مشہور مغنی اور مصنف اسحاق بن ابراہیم الموصلی کے ایک قصیدے میں ملتا ہے جو اس نے اس وقت کہا تھا جب عباسی خلیفہ الواثق (۲۳۲-۲۳۳ھ) وہاں سیر و تفریح و شکار کے لئے آیا تھا۔

یاقوت (وفات ۶۲۶ھ) نے اپنی مذکورہ بالا جغرافیائی ڈکشنری معجم البلدان میں مادہ "نجف" (۱۵) کے تحت یہ قصیدہ پیش کیا ہے' جس کا ایک شعر ہے۔

ما ان اری الناس فی سہل ولا جبل

اصفی ھواء ولا اعذب من النجف

(حقیقت یہ ہے کہ لوگوں نے میدانوں اور پہاڑوں میں نجف سے زیادہ عمدہ اور پر فضا مقام نہیں دیکھا)

اس قصیدے کے صرف چند اشعار عربی ادب کی مشہور کتاب الاغانی۔ ابو الفرج الاصفہانی کی پانچویں جلد میں (۱۶) اسحاق بن ابراہیم الموصلی کے سوانحی خاکہ میں موجود ہیں۔

ظاہر ہے کہ "نجف" کا یہ ذکر ۲۳۲ھ سے پہلے کی بات ہے اور اس تیسری صدی ہجری کے نصف اول میں ایک اور مشہور سیاسی و ادبی شخصیت علی بن محمد بن جعفر الحمانی (وفات ۲۶۰ھ) نے بھی نجف کا ایک قصیدے میں ذکر کیا ہے جس کے تین اشعار یاقوت نے نقل کئے ہیں جس کا ایک شعر ہے۔

فیا اسفی علی النجف المعری و اودیۃ منورۃ الاقاصی

(ہائے وہ نجف جو ویران و متروک ہے۔ اور وہ وادیاں جن میں بابونے کے پھول کھلے ہوئے ہیں)

(مولانا تقی عثمانی صاحب نے نجف کے وصف کے ذکر (ص ۷۳) میں ایک عجیب غلطی کا ارتکاب کیا ہے' انہوں نے بغدادی کی مراصد الاطلاع کے حوالہ سے لکھا ہے کہ "یہاں ربض اور نجف نام سے دو چشمے تھے" اگر وہ اصل کتاب یعنی یاقوت کی معجم البلدان "(مراصد الاطلاع" جس کا اختصار ہے) دیکھتے تو ان کو معلوم ہوتا کہ یاقوت نے سہیلی (مصنف روض الانف) کے حوالے سے یہ ایک دوسری بستی الفرع کے چشمے بتائے ہیں اور الفرع کے ذکر میں ملے گا کہ یہ نواح مدینہ میں ایک گاوں تھا۔ اس کا عراق کے نجف سے کوئی تعلق نہیں۔

یہ علی بن محمد الحمانی امام جعفر صادق کے پوتے تھے اور انہوں نے مکہ مکرمہ میں کچھ دوسرے علوی سادات کے ساتھ مل کر المامون کے عہد میں بغاوت کی تھی' پھر المامون نے ان کو معاف کر دیا تھا۔ یاقوت نے ان کے سن وفات کا ذکر نہیں کیا ہے۔ یہ ہم کو ترکی علامہ ڈاکٹر فواد سیزگین کی تاریخ التراث العربی سے معلوم ہوا' اس سے جہاں نجف کے نام پر روشنی پڑتی ہے جس کا ذکر چوتھی صدی ہجری کے مشہور جغرافیہ نویسوں' اصطخری' ابن حوقل وغیرہ نے نہیں کیا' وہیں اس وقت نجف کی حالت زار کا بھی پتہ چلتا ہے۔ لسان العرب کے مطابق "معری" اس شئے کو کہتے ہیں جس کو متروک کر دیا گیا ہو۔ ہمارے خیال میں اس علوی شاعر نے یہ قصیدہ عباسی خلیفہ المتوکل کے زمانے میں کہا ہے' جو اپنی ناصبیت (اہل بیت سے عداوت) میں مشہور تھا اور جس نے ۲۳۶ھ یعنی اسی سیاسی و ادبی شخصیت کے زمانے میں سیدنا حسینؓ کا مزار کربلا میں کھدوا کر وہاں ہل چلوا دیا تھا اور ان کے معتقدین کو سختی کے ساتھ منع کر دیا تھا کہ وہ اس مقام کا رخ نہ کریں۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں متوکل عباسی کے خوف اور ناپاک ارادے سے متاثر ہو کر لوگوں نے حضرت علیؓ کی قبر پر بلکہ "نجف" جانا ہی ترک کر دیا تھا۔ اس لئے اس علوی شاعر نے اس شعر میں اپنے افسوس کا اظہار کیا ہے۔

نجف کا ذکر تو ہم کو تیسری صدی ہجری کے نصف اول میں مل گیا۔ لیکن اس سے اہم بات یہ ہے کہ قدیم عالم عرب کے عظیم ترین جغرافیہ نویس علامہ یاقوت نے اس موقع پر نجف کی

جو تحدید بیان کی ہے اس سے یہ بات متعین ہوتی ہے کہ نجف اور ظہر کوفہ ایک ہی چیز ہیں کہ نجف ایک لانبے پشتے کی طرح تھا جو کوفہ اور اس کے قبرستان میں دریائے فرات کے پانی کے سیلاب کو روکتا تھا۔ اور اس سے زیادہ اہم بات اس سنی علامہ نے یہ لکھی ہے۔

"و بالقرب من هذا الموضع قبر امیرالمومنین علی ابن ابی طالب رضی الله عنه"

(اور اس جگہ کے قریب ہی امیرالمومنین علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی قبر ہے)

یہ چھٹی صدی ہجری کے ربع اول کی تحریر ہے۔ اس وقت تک نہ تو ایلخانی تاتاریوں کی شیعہ نواز حکومت قائم ہوئی تھی اور نہ ایران کی شیعی صفوی حکومت' بلکہ آزاد سنی عباسی خلافت موجود تھی۔ اس لئے یاقوت کے بیان کے بارے میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں۔

افسوس کہ نجف کی تاریخ اور وہاں حضرت علیؓ کی قبر کے بارے میں دائرہ معارف اسلامیہ پنجاب یونیورسٹی کے مقالہ نگار جناب مرتضیٰ حسین فاضل نے بھی ان مذکورہ بالا قدیم عربی شعراء اور یاقوت سے مدد نہیں لی۔ انھوں نے زیادہ تر بعد کے شیعی ماخذ پر اپنے فاضلانہ مقالے کی بنیاد رکھی ہے۔

اب ثابت ہو گیا کہ ظہر الکوفہ اور نجف اسی کوفہ کا ایک حصہ ہیں جو حضرت عمرؓ کے زمانے میں ایک پر فضا صحرائی مقام میں آباد کیا گیا تھا اور ظہر الکوفہ یا نجف میں ہی حضرت علیؓ دفن ہیں۔

اب سوال یہ رہ جاتا ہے کہ حضرت علیؓ کے مزار پر گنبد و عمارت کب تیار ہوئی تو اس ذیل میں قدیم ترین بیان چوتھی صدی ہجری کے جغرافیہ نویس ابن حوقل کا ہے جس نے ۳۶۵ھ میں اپنی کتاب "صورۃ الارض" (نقشہ دنیا) مکمل کی۔ وہ رقمطراز ہے۔ (باب ذکر الکوفہ) کہ "کوفہ میں حضرت علیؓ کی قبر ہے جو شہر کوفہ سے دو کوس کے فاصلے پر ہے" (۱۷) (وہی ظہرالکوفہ یا نجف ہوا) ابو الصیحاء عبداللہ بن حمدان نے اس جگہ کو مشہور کیا' وہاں ایک احاطہ بنوایا۔ قبر مبارک پر ایک بلند و بالا گنبد تعمیر کیا۔ جس کے چار دروازے قائم کئے۔ اس مزار میں اعلیٰ قسم کے پردے لٹکوائے اور قیمتی قسم کی ترکستانی چٹائیاں بچھوائیں' گنبد کے باہر ان کے متعدد عظیم فرزندان اور سادات آل ابی طالب دفن ہیں"۔

یہ ابوالھیجاء عبداللہ بن حمدان کون ہے اور کب تھا؟ ابن الاثیر' و ابن خلدون وغیرہ کی تواریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ ابوالھیجاء جس کی وفات ۳۱۷ھ ہے ۲۹۳ھ میں موصل کا والی مقرر ہوا' وہ اس تیسری صدی ہجری کا ایک مشہور فوجی قائد تھا اور جس کے نام پر شمالی عراق میں چوتھی صدی ہجری میں ایک نیم آزاد حکومت (دولت حمدانیہ) قائم ہوئی۔

اردو دائرہ معارف اسلامیہ' پنجاب یونیورسٹی کے مقالہ "نجف" کے مقالہ نویس مرتضیٰ حسین فاضل کے بیان کے مطابق عبداللہ بن حمدان نے مزار کی یہ تعمیر و تزئین ۲۶۰ھ میں کی (لیکن ان کا ماخذ ایک عصر حاضر کی عربی کتاب "مدنیہ الحسین کربلاء" ہے) بہرحال یہ بات یقینی ہے کہ نجف میں گنبد مزار کی تعمیر تیسری صدی ہجری میں ہوئی۔

یہ بات خطیب بغدادی کی وفات (۴۶۳ھ) سے دو سو سال قبل کی ہے۔ اب یہ ظاہر ہے کہ جب دوسری صدی ہجری کا ایک مورخ (ابن سعد) اور چوتھی صدی و ساتویں صدی ہجری کے انتہائی مشہور اور ثقہ جغرافیہ نویس کوفہ کی ایک نواحی بستی ظہر الکوفہ ۔ نجف میں حضرت علیؓ کی قبر کی تصدیق کرتے ہیں تو خطیب بغدادی کے اٹھائے ہوئے شکوک و شبہات کی کیا قیمت رہ جاتی ہے؟

یہاں ایک قابل ذکر بات یہ ہے کہ ۳۱۲ھ اور ۳۱۵ھ میں دو بار قرمطی حکمران طاہر جنابی نے جزیرہ عرب کے اپنے مشرقی پایہ تخت ہجر سے آکر کوفہ کو تاراج کیا۔ وہ اثنا عشری شیعوں کا بھی دشمن تھا' پھر اس کے بعد دوبارہ کوفہ اپنی مستقل حیثیت قائم نہ رکھ سکا۔ جب ۳۵۸ھ میں جغرافیہ نویس ابن حوقل نے اس کا حال لکھا ہے تو اس وقت اس کے بیان کے بموجب وہ بغداد کے زیر انتظام تھا۔

اس کے چند سال بعد ہی نجف کی حیثیت ابھرنا شروع ہوئی۔ جب مشہور ایرانی شیعی خاندان کے حکمران عضد الدولہ البویہی نے حضرت علیؓ کے مزار پر ۳۶۶ھ میں ایک نیا گنبد تعمیر کیا' لوگوں کو آباد کر لیا تو آٹھویں صدی ہجری کے ایرانی مورخ مستوفی کے بیان کے مطابق عضد الدولہ کے وقت سے یہ ایک چھوٹا سا شہر بن گیا' آل بویہ کا یہ طاقت ور حکمران (عباسی خلفاء جس کے زیر نگیں تھے) اور اس کے بیٹے یہیں دفن ہیں۔ یہ خطیب بغدادی کی وفات سے سو سال قبل کی بات ہے۔ اس کے بعد سے کوفہ کی حیثیت گرتی ہی چلی گئی اور اس کی نواحی بستی نجف کو وہ

مقام حاصل ہو گیا جو کبھی کوفہ کو تھا اور یہ سب حضرت علیؓ کے مزار کے سبب ہوا۔

جغرافیہ دان ابن حوقل کے اس بیان کے بعد کہ ابوالھیجاء عبداللہ بن حمدان نے کوفہ کی نواحی بستی نجف میں ۲۶۰ھ حضرت علیؓ کے مزار پر گنبد تعمیر کیا اور دوسری زیب و زینت کی' ان مطین صاحب کے بیان کی کیا قیمت رہ جاتی ہے کہ اس قبر میں حضرت علیؓ نہیں بلکہ مغیرہؓ بن شعبہ دفن ہیں۔ ان مطین صاحب کی زندگی ہی میں اس مزار کو ایک بڑا مرتبہ مل چکا تھا' کیونکہ ناصبی خلیفہ متوکل عباسی کا دور گذر چکا تھا جس میں حضرت علیؓ کی قبر پر آمد و رفت اس کے ظالمانہ رویے کی وجہ سے بند ہو گئی تھی' وہ تو نشے کی حالت میں اپنے ہی ترک غلاموں کے ہاتھوں اپنے نئے شہر و محل جعفری (سامراء) میں قتل ہوا اور اس کی قبر کا بھی کہیں نام و نشان نہیں جبکہ حضرت علیؓ اور حضرت حسینؓ کی قبور آج بھی مرجع خاص و عام ہیں۔

مزید برآں اگر مشہور انگریز مستشرق Le Strange کی کتاب The Lands of the Eastren Caliphete (کیمبرج ۱۹۰۵ء) جس کا ترجمہ عربی میں بلدان الخلافہ الشرقیہ کے نام سے عرصہ ہوا ہو چکا ہے اس میں اور عصر حاضر کے عراقی عالم ڈاکٹر احمد سوسہ کے اٹلس "العراق فی خوارط العالم القدیمہ" میں کوفہ' نجف اور حیرہ کو دیکھا جائے تو ایک دوسرے سے اتنے ہی قریب قریب ہیں جیسے آج کراچی میں صدر کے علاقہ سے کورنگی یا ملیریا نارتھ کراچی۔ نجف ایک زمانہ میں کوفہ کا ایک حصہ تھا' اب وہ ایک بڑا اور مستقل شہر ہے' جبکہ کوفہ ایک چھوٹا سا گاوں ہے (۱۹)۔

یہی نہیں کہ حضرت علیؓ کا مزار شیعہ حضرات کے نزدیک ہی مقدس و متبرک رہا ہے' اردو دائرہ معارف اسلامیہ پنجاب یونیورسٹی (۲۰) کے مقالہ نگار کے بیان کے مطابق تو پہلے عباسی خلیفہ السفاح کے چچا داود بن علی بن عبداللہ بن عباس نے ۱۳۳ھ میں حضرت علیؓ کی قبر پر لکڑی کا ایک صندوق رکھوایا اس کے بعد سے قبور نجف و کربلا پر صندوق رکھنے کا سلسلہ چلا آ رہا ہے۔ پھر ۳۳۴ھ میں عراق اور عباسی خلافت پر مسلط ایران کے حکمران خاندان بنو بویہ کے مختلف بادشاہ بلکہ ان کے زوال اور سلجوقی سلطنت کے قیام اور عباسی خلافت پر اس کے تسلط کے بعد اس کے بعض سلاطین' ملکشاہ اور اس کا بیٹا سلطان سنجر بھی پانچویں صدی ہجری کے اواخر میں حضرت علیؓ کے مزار کی زیارت کو آئے اور انہوں نے یہاں تحائف و ہدایا دیئے۔

اس طویل بحث کے بعد یہ بات واضح ہو گئی کہ حضرت علیؓ کی قبر کے بارے میں اٹھائے ہوئے شکوک و شبہات بے بنیاد ہیں۔ نجف ہی کوفہ کا وہ علاقہ ہے جس کو قدیم ترین مستند عربی ماخذ میں ظہر الکوفہ کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔ اور یہیں حضرت علیؓ دفن ہوئے تھے۔ اموی اور متوکل عباسی کے عہد میں یہ قبر اس لئے مخفی رکھی گئی کہ اندیشہ تھا کہ عداوت کی وجہ سے اس کی بے حرمتی نہ کی جائے۔ ۲۶۰ھ سے برابر یہ مزار مرجع خلائق رہا ہے۔ حضرت علیؓ کی اس قبر مبارک کے سبب ہی نجف ایک شہر بنتا چلا گیا۔ جبکہ کوفہ تباہی و بربادی کے ادوار سے ایک زمانہ میں بالکل ویران ہو گیا تھا اور اب ایک گاؤں ہے۔

حضرت معاویہ کی قبر

ہم نے شروع میں عرض کیا تھا کہ مولانا تقی عثمانی صاحب دمشق میں حضرت معاویہؓ کی جس قبر کی زیارت کرکے اور اس پر فاتحہ پڑھ کر خوش ہوئے وہ ان کی نہیں بلکہ قدیم و جدید روایات و تحقیق کے مطابق وہ ایک دوسری جگہ ہے' اب مختصراً اس کی وضاحت ضروری ہے۔

مولانا محمد تقی عثمانی صاحب نے حضرت معاویہؓ کے اس مزار کی زیارت کو بڑے ڈرامائی انداز میں بیان کیا ہے کہ وہ اپنے سیاحتی گائیڈ کے بتانے کے مطابق جامع اموی کے قریبی علاقے میں پیچ در پیچ گلیوں سے گذرتے ہوئے پرانے طرز کے ایک بوسیدہ مکان پر پہنچے' دروازے پر دستک دینے پر ایک عمر رسیدہ خاتون نے جواب دیا' جب ان سے کہا گیا کہ پاکستان سے کچھ حضرات مزار کی زیارت کے لئے آئے ہیں تو خاتون نے جواباً کہا کہ اس کے لئے محکمہ اوقاف سے اجازت نامہ لانا ضروی ہے۔ اس کے بعد جناب مولانا نے یہ انکشاف کیا ہے کہ حکومت نے عام زیارت کے لئے اس کو بند کو رکھا ہے اور وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ بعض روافض یہاں آکر شرارت اور مزار کی بے حرمتی کا ارتکاب کرتے ہیں۔ (یاد رہے کہ ۱۹۸۶ء میں جب حضرت مولانا صاحب نے یہ زیارت کی ہے تو اس وقت بھی "غالی روافض" کا نمائندہ یعنی نصیری فرقہ کا حافظ الاسد وہاں کا صدر تھا)۔

لیکن جب پاکستانی سفارت خانے کے عنایت صاحب نے سفارش کی اور جناب مولانا کا تعارف کرایا تو خاتون نے اندر جانے کی اجازت دے دی اور پھر اندر مکان میں "ایک کمرے کے اندر جا کر چند قبور دیکھیں جن میں سے ایک قبر حضرت معاویہؓ کی بتائی جاتی ہے"

اب جناب مولانا کی اس روئیداد زیارت کی مناسبت کے ساتھ انتہائی افسوس کے ساتھ عرض کرنا پڑتا ہے کہ جہاں وہ تشریف لے گئے وہاں حضرت معاویہؓ کی قبر کا وجود نہیں بلکہ وہ دمشق کے مشہور قبرستان باب الصغیر میں ہے' توضیح اس کی یہ ہے کہ مولانا تقی عثمانی صاحب نے اپنے اس سفرنامے میں دمشق ہی کے ایک مشہور زمانہ علامہ ذہبی کی کتاب سیر اعلام النبلاء کے حوالے دیئے ہیں۔ جو یقیناً ان کے دارالعلوم کے کتب خانہ میں ہوگی' اگر وہ اس عظیم و ضخیم کتاب کی تیسری جلد میں حضرت معاویہؓ کی سوانح حیات پڑھیں تو صفحہ ۱۶۰ پر نظر آئے گا کہ اس میں حضرت معاویہؓ کی قبر "باب الجابیہ اور باب الصغیر" کے مابین بتائی گئی ہے (۲۱)۔

اور پھر اس کتاب کے شامی محققین نے فٹ نوٹ (نمبر۳) میں وضاحت کی ہے کہ "حضرت معاویہؓ کی قبر اب الباب الصغیر کے قبرستان میں داخل ہو گئی ہے جو دمشق کا ایک قبرستان ہے' اور وہاں اب تک معروف ہے' اور حکومت نے ان آخری برسوں میں اس کی عمارت کی تجدید کر دی ہے۔

امام ذہبی کے بیان اور سیر اعلام النبلاء کے محققین کی وضاحت کے بعد (جو مولانا تقی عثمانی صاحب کی سیاحت دمشق سے پانچ سال پہلے کی بات ہے' کہ یہ کتاب ۱۹۸۱ء میں چھپ گئی تھی) یہ بات تحقیق سے معلوم ہو گی کہ دمشق میں جناب مولانا کسی گمنام قبر کو حضرت معاویہؓ کی قبر سمجھ کر اس کی زیارت کر آئے اور ان کو اس میں ذرا سا بھی شک و شبہ نہ ہوا۔ جبکہ حضرت علیؓ کی قبر سے متعلق ایسے مصنف کے حوالے سے جس پر ناصبیت کا الزام ہے' شکوک و شبہات پیدا کئے ہیں۔

اس موقع پر مزید وضاحت کے لئے عرض ہے کہ قبرستان الباب الصغیر جامع اموی کے علاقے سے کافی دور دمشق کے مشہور محلّہ "المیدان" کو جاتے ہوئے اس کی بائیں سمت ہے' جہاں حضرت بلالؓ اور دوسرے صحابہ کی قبور ہیں۔ راقم الحروف دمشق یونیورسٹی کے کلیتہ الشریعہ میں اپنی دینی و عربی تعلیم کے سلسلہ میں چار سال اور پھر ایک سال اپنی پہلی عربی کتاب "العز بن عبدالسلام الدمشقی" کی تصنیف و طباعت کے سلسلہ میں (ستمبر ۱۹۵۵ء تا اگست ۱۹۶۰ء) مقیم رہا۔ لیکن اس کو جامع اموی کے قرب و جوار میں حضرت معاویہؓ کی کسی قبر کا پتہ نہیں چلا۔ جبکہ اسی علاقہ میں واقع مشہور کتب خانہ ظاہریہ میں وہ مہینوں کام کرتا رہا ہے اور اس کتب خانے کے اس

وقت کے لائبریرین اور عظیم مصنف الاستاذ عمر رضا کحالہ مرحوم سے بھی اس کی اکثر ملاقات رہتی تھی۔ اور برابر میں المجمع العلمی العربی (عرب اکیڈیمی) کے ذمہ دار اور محققین سے بھی، کسی نے بھی حضرت معاویہؓ کی اس قبر کے بارے میں میری کوئی راہ نمائی نہیں کی۔

استاذ معظم جناب مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ (ہندوستان کے مولانا علی میاں صاحب) بھی ۱۹۵۰ء اور ۱۹۵۶ء میں دو بار دمشق گئے اور دوسری بار وہاں دو ماہ سے زائد مقیم رہے۔ انہوں نے بھی اپنا "سفرنامہ" مذاکرات مسائع فی الشرق الاوسط" کے نام سے شائع کیا جس کا اردو ترجمہ ہو چکا ہے۔ اس میں بھی کہیں حضرت معاویہؓ کی اس قبر کا ذکر نہیں۔

آخر میں عرض ہے کہ راقم الحروف خطیب بغدادی اور مولانا تقی عثمانی دونوں صاحبان کے علم کا معترف اور قدردان ہے۔ خطیب کی نہ صرف تاریخ بغداد بلکہ علوم حدیث کے موضوع پر "الکفایہ فی علم الروایہ" اور "تقیید العلم" بے نظیر کتابیں ہیں۔

حواشی

۱۔ مولانا محمد تقی عثمانی، جہان دیدہ، ص ۷۳، ۷۴۔ طبع ۱۹۹۴ء۔ کراچی

۲۔ خلیفہ بن خیاط۔ تاریخ خلیفہ ابن خیاط، ص ۲۰۹۔ طبع بیروت

۳۔ ذہبی، سیر اعلام النبلاء، ج ۱۸ ص ۳۸۲، مؤسسہ الرسالہ بیروت، نیز یاقوت، معجم الادباء، ج ۱ ص ۲۵۶، المطبعہ الندیہ، مصر۔

۴۔ ابن خلکان، وفیات الاعیان، ج ۵ ص ۵۱۳، تحقیق احسان عباس، دارالثقافہ، بیروت

۵۔ ذہبی، سیر اعلام النبلاء، ج ۱۲ ص ۵۰۷، مؤسسہ الرسالہ، بیروت

۶۔ ابن سعد، طبقات ابن سعد، ج ۲ ص ۳۸، طبع بیروت

۷۔ ذہبی، تذکرۃ الحفاظ، ج ۳ ص ۱۱۴۲، طبع حیدر آباد

۸۔ ابن کثیر، البدایہ والنہایہ، ج ۷ ص ۳۲۹، دار الفکر بیروت

۹۔ مسلم، مقدمہ صحیح مسلم

۱۰۔ ابن سعد، طبقات ابن سعد، ج ۲، ص ۳۸، طبع بیروت

۱۱۔ ابن عبدالبر، الاستیعاب، ص ۳۱۳ حاشیہ الاصابہ، دار الاحیاء التراث العربی بیروت

۱۱(الف)۔ابن حجر، الاصابہ، ج ۳ ص ۳۲۳

۱۲۔ بلاذری، فتوح البلدان، ص ۳۵۱، طبع مکتبہ النہضہ العربیہ ۔ القاہرہ

۱۳۔ ایضاً

۱۴۔ ایضاً

۱۵۔ یاقوت، معجم البلدان، ج ۵، ص ۲۷۱ زیر مادہ "نجف"

۱۶۔ ابو الفرج الاصفہانی، الاغانی، ج ۵ ص ۔۔۔ طبع، دار الکتب العلمیہ بیروت

۱۷۔ ابن حوقل، صورۃ الارض، باب ذکر الکوفہ، ص ۲۱۵، طبع دار مکتبہ الحیاء بیروت

۱۸۔ اردو دائرہ معارف اسلامیہ ۔ زیر مقالہ "نجف"

۱۹۔ بلدان الخلافہ الشرقیہ، ص ۴۰، مؤسسہ الرسالہ، بیروت

۲۰۔ اردو دائرہ معارف اسلامیہ، ج ۲۲، ص ۱۳۹، پنجاب یونیورسٹی لاہور

۲۱۔ ذہبی، سیر اعلام النبلاء ۔ ج ۳ ۔ ص ۱۶۰، مؤسسہ الرسالہ، بیروت